بھی مختلف قوموں میں مختلف عرصے تک قائم رہا۔ پھر جب اس کا سحر ٹوٹا تو وطنی جذبات کی باری آئی، اور وطنی عصبیت کی بنا پر حکومتوں کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے نتائج بھی ایک نہج کے نہیں ہیں، اس کے بعد یا ساتھ ساتھ زندگی کا اب ایک دوسرا تصور ابھر رہا ہے جو اقتصادی استواریوں سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے ــــ یہ بھی نسبتہً اس وقت تک انقلاب و تغیر آفرینیوں کا باعث بنا رہیگا۔ جب تک کہ کوئی تیسرا زاویۂ نگاہ انسانی علم میں نہیں آتا۔ یعنی قوموں کی زندگی و موت ان کے خیالات و افکار کی زندگی و موت سے وابستہ ہے۔ نہ ان مفروضہ اجیال سے جن کی ابن خلدون نے تصریح کی ہے۔ اس لئے تاریخی نقطۂ نظر سے یہ نظریہ بلاشبہ صحیح ہے کہ ہر قوم کو ترقی و انحطاط کے ادوار کا سامنا کرنا پڑتا ہے، شباب، بڑھاپا اور موت۔ اگرچہ یہ صحیح نہیں کہ یہ تین دور چالیس برس ہی کے عرصہ پر مشتمل ہوں۔

کچھ اور عوامل جمہوریت اس کے سوا حکومتوں اور سلطنتوں کے عروج و زوال پر اثر انداز ہونے والے کچھ اور عوامل بھی ہیں جن کو نظر انداز کی طرف پہلا قدم نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہ دیکھنا کہ کس قوم سے واسطہ پڑا ہے۔ اور وہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے کس سطح پر فائز ہے، کیونکہ اگر ایک گھٹیا قوم جو نظری و فطری اعتبار سے اپنے ہی محکموں سے کہیں پیچھے ہے محض اتفاقی حادثات سے برسر اقتدار آگئی ہے تو اس کی عمر زیادہ لمبی اور طویل نہیں ہو سکتی، اور اگر اس کے برعکس کسی حکمران طاقت کو محکوم ایسے ملے ہیں جو اقدار حیات میں ان سے پیچھے ہیں۔ اور صدیوں تک ہوش میں آنے والے نہیں۔ تو اسی نسبت سے اس کا اقتدار زیادہ دیرپا ہوگا۔

دراصل ترقی و انحطاط کا ایک ہی ہمہ گیر عامل ایسا ہے جو بڑی مدت تک بھروسہ کے لائق ہے۔ اور ابن خلدون نے اسی فصل میں اس کی نشاندہی بھی کی ہے وہ یہ ہے کہ آیا محکوم یہ سمجھتے ہیں، کہ حکومت کے در و بست میں ان کا بھی حصہ ہے؟ اور اسکے اقتدار میں انکی بھی شرکت ہے۔ اگر یہ احساس ان میں موجود ہے تو حکومت چلے گی اور قائم رہیگی۔ اور اگر محکوم یہ محسوس کرنے لگینگے کہ اقتدار کی اس مشینری سے صرف حکومت کے چند لگے بندھے ہی فائدہ اٹھاتے ہیں، اور اس میں ان کا کوئی ساجھا نہیں تو سمجھ لیجئے، کہ زوال کے دن بالکل قریب ہیں۔

اس انداز فکر سے حکومت کا یہ بالکل عصری تصور سامنے آتا ہے۔ کہ حکومت ایسی ہونی چاہیئے۔ کہ ہر ہر فرد یہ محسوس کرے، کہ اس کے نظم و نسق کو قائم رکھنے، اور اس کے عزائم اور منصوبوں کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری میں یہ برابر کا شریک ہے۔ یہی جمہوریت کی روح ہے اور حکومت کا وہ تصور ہے جو برقرار رہ سکتا ہے۔

ایک نازک سوال، کیا مذہبی معاشرہ کو بھی ان اجیال کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ اس مرحلہ پر ایک نہایت ہی نازک سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا دینی معاشرے بھی اس ہمہ گیر قانون کی زد میں آتے ہیں؟ اور ان کے لئے بھی شباب، کہولت اور فنا کی جانی بوجھی تین منزلیں متعین اور مقرر ہیں؟ جواب یہ ہوگا کہ یقیناً اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابن خلدون کے نقطۂ نظر سے مذہب ایک خارقہ اور معجزہ ہے اور معاشرہ کے تقاضوں سے ظہور پذیر ہونے والا نہیں۔ بلکہ معاشرہ کی سمتوں کو سراسر بدلنے والا ہے اور معاشرہ کے اندرونی مطالبات سے ہٹ کر اس کی اپنی ایک چال اور منزل ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ مذہب کی گرفت دلوں پر بہت مضبوط ہے اور یہ گرفت آسانی سے زائل ہونے والی نہیں لیکن اس وقت گفتگو نفس مذہب سے نہیں، معاشرہ سے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ جب بھی کوئی معاشرہ کسی دینی یا غیر دینی خیال کو اپنائے گا اور اس کے بل بوتے پر زندگی کے خارزار میں قدم رکھے گا تو اسے لامحالہ عروج و زوال کے انہیں سرد و گرم ادوار سے دوچار

ہونا پڑے گا۔ تاریخی اعتبار سے اس پر بحث و فکر کی حاجت نہیں بیسیوں مذاہب آپ کے سامنے ہیں۔ آپ ان کے ماضی پر ایک سرسری نظر ڈال جائیے اور یہ دیکھئے کہ انھوں نے کس حد تک انسانی دلوں پر قابو پایا۔ کس درجہ اقتدار حاصل کیا اور جغرافیہ و وقت کی کتنی وسعتوں کو گھیرا۔ لیکن آج وہ کہاں ہیں؟ کیا تاریخ کے صفحات کے سوا ان کا کہیں ذکر ہے؟ اور زمین میں پتھر کی دبی اور گڑی ہوئی سلوں کے سوا ان کا کہیں سُراغ ملتا ہے؟

اس ضمن میں دریافت طلب تنقیح یہ ہے کہ جہاں تک دنیاوی حکومت و اقتدار کا تعلق ہے۔ اس کی چونکہ استواری و محکمی بالکلیہ عصبیت اور ایسے تصوّرات و خیالات سے مشابہ ہے۔ جن کے مرکز تبدیلیٔ احوال سے بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان پر اگر زوال و انحطاط کے سائے اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ تو یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔ دُنیا کی محدود تحریکات کو ختم ہونا ہی چاہیئے لیکن مذہب تو عقیدہ و عمل کی ابدی سچائیوں کو پیش کرتا ہے جو زمانہ کی گردشوں سے متاثر ہونے والی نہیں۔ ان پر اس قانونِ تغیّر کا اطلاق ہو تو کیوں؟

بات یہ ہے کہ مذہب اگر عالم تجرید میں رہے اور زمین پر اُتر کر معاشرہ کا جزو نہ بنے تو یقیناً زمان و مکان کی تبدیلیوں سے اس کا متاثر ہونا ضروری نہیں لیکن یہ جب تجرید سے نکل کر ایک تعیّن اختیار کرتا ہے جس پر لیل و نہار کے بدلتے ہوئے قوانین اپنا سایہ ڈالتے ہیں تو اسکو بھی ناچار شباب و کہولت اور موت و فنا کی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

اسی تنقیح پر متفرع ایک اور تنقیح کو بھی صاف ہونا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ تعیّن کے ان نقائص سے جن پر زمانہ اپنا اثر ڈالتا ہے مذہب کو کسی صورت میں بچایا بھی جا سکتا ہے؟ دُوسرے لفظوں میں کیا احیاء تجدید کی کوششیں اس بارہ میں کامیاب ہو سکتی ہیں؟ اور کوئی مذہب پہلی سی شان و شوکت دوبارہ حاصل کر سکتا ہے؟

اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ہمیں بیک وقت بحث و نظر کے تین رُخوں کو سامنے رکھنا پڑے گا:۔

(۱) تاریخ۔

(۲) افراد کی صلاحیت تجدید و احیاء۔

(۳) اور خود زیر بحث مذہب کی بناوٹ اور ساخت۔

یعنی یہ دیکھنا ہوگا کہ احیاء و تجدید کی مساعی کی ان سمتوں سے تائید ہوتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس مسئلہ میں یہی وہ تین جہتیں ہیں جن سے کہ ان امکانات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ جہاں تک تاریخ کے اپنے تجربات کا تعلق ہے یہ تجدید و احیاء کی حمایت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس نے بہتیرے مذاہب کو افقِ حیات پر چمکتے اور بالآخر اپنی کرنوں کو سمیٹتے ہوئے دیکھا ہے ——— اور اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا مشاہدہ بھی اس کی آنکھوں نے کیا ہے، کہ ہدایت و رہنمائی کے یہ قافلہ ہائے نور جب ایک مرتبہ پلٹتے ہیں تو پھر بھول کر بھی انھوں نے کبھی یاد نہیں کیا۔ کہ کچھ لوگ ان کے پہلے کی طرح منتظر اور چشم براہ ہیں۔

اس لئے جہاں تک تاریخی استشہاد کا تعلق ہے۔ اس طرف سے پوری پوری مایوسی ہے اور یہ تجدید و اصلاح کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی نہیں۔

افراد کی قوتیں بلاشبہ بے پناہ ہیں۔ اور ہر ہر انقلاب انھیں کی جنبشِ فکر و عمل کا رہین منت ہے لہٰذا ان میں اگر کچھ عزیمت کے لوگ پیدا ہو جائیں جو زمانے کی مُنہ زوریوں کا مقابلہ کر سکیں اور اس کے رخوں کو بدل سکیں، تو مذہب کا احیاء ہو سکتا ہے لیکن تنہا افراد کی طاقت بھی تو کافی اور فیصلہ کُن عامل نہیں اس لئے احیاء و تجدید کے امکانات کا جائزہ لینے کے لئے مسئلہ کے تیسرے رُخ یعنی مذہب کی بناوٹ اور ساخت پر بھی غور کرنا پڑے گا۔

اگر مذہب ایسا ہے کہ اس کے تعینات کو پھر سے تجرید کے قریب لایا جا سکتا ہے۔ اس کا فلسفۂ حیات ایسا ہے جو نظروں میں بچ سکتا ہے اور فکر و عمل کے داعیات کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ جزئیات و فروع اس ڈھنگ کی ہیں کہ ہمہ گیر اور ابدی اقدار کے مطابق ڈھل سکتی ہیں۔ تو مذہب زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اپنی گرفت کو دلوں پر برابر قائم رکھ سکتا ہے بصورتِ دیگر نہیں۔

ابنِ خلدون نے ایک مقام پر احیاء و تجدید کے امکانات کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو مستبعد نہیں سمجھتا۔

مختصراً یہ ہیں وہ جستہ جستہ عمرانی تصورات جو ابنِ خلدون نے پیش کئے اور جن کی وجہ سے اس کا نام یورپ میں روشن ہوا۔ یہاں تک کہ اچھے اچھے مستشرقین کو کہنا پڑا کہ ارسطو سے لیکر میکاولی اور مانٹیسکیو تک اس کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔

افکارِ غزالی مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی۔ اس میں یہ کوشش کی گئی ہے، کہ "احیاء العلوم" کی مختصر مگر مستند تلخیص پیش کی جائے جس میں غزالی کے تمام علمی و اصلاحی افکار کی جھلک موجود ہو۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ علم اور اس کے حدود کیا ہیں؟ علماءِ حق یا طالبانِ آخرت اور علماءِ سوء یا شیفتگانِ رذائلِ دُنیا میں کیا فرق ہے؟ زندگی کے فقہی انداز میں کیا قباحتیں ہیں؟ مناظرہ و جدل کیوں ناجائز ہے؟ ریا کیا ہے؟ اخلاص کس سے تعبیر ہے؟ اصلاحِ باطن کیوں ضروری ہے؟ ظاہر و معنی میں کیا ربط ہے؟ اور کہاں کہاں؟ ہم مجبور ہیں کہ الفاظ و ظواہر کے اقتضاء کو چھوڑ کر مغز و معنی اور روح و اصل کی طرف رجوع کریں۔ اس ڈھنگ کی بیسیوں عارفانہ بحثیں ہیں جو اس کتاب کی دستوں میں سمٹ آئی ہیں۔ قیمت پانچ روپے۔

افکارِ ابنِ خلدون مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی۔ اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ مقدمہ میں ابن خلدون نے اجتماعیات کے متعلق کن حکیمانہ افکار کو پیش کیا ہے۔ اور فلسفۂ تاریخ پر کیا روشنی ڈالی ہے تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کیجئے۔ اس میں عمرانیات پر سیر حاصل بحثیں ہیں۔ قومیں کیونکر معرضِ ظہور میں آتی ہیں؟ انکی زندگی اور موت کن اسباب پر مبنی ہوتی ہے؟ خلافت کیا ہے؟ ملوکیت کیوں اُبھری؟ کیا کائنات کسی ارتقائی سلسلہ کا نام ہے؟ نبوت کسے کہتے ہیں؟ تصوف کے کیا حدود ہیں؟ اور علوم و فنون اور زندگی کے دوسرے ظہورات کی اجتماعیت میں کیا حیثیت ہے؟ اس انداز کے بیسیوں سوالات کا جواب آپ کو اس میں ملے گا۔ علاوہ ازیں اس میں ابن خلدون کے مفصل سوانح حیات بھی دیئے گئے ہیں۔ اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے جن جن شکوک کو پھیلایا ہے ان کا بھی تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

ملنے کا پتہ: سکریٹری، ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان

پروفیسر سید عابد علی عابد

زوالِ دولتِ عباسیہ اور ابن العلقمی

دولتِ عباسیہ کے زوال کی داستان نہایت عبرتناک ہے وہ دورمان جلیل جو صدیوں مقبوضات ہی پر نہیں بلکہ مسلمانوں کے قلوب پر بھی حکومت کرتا رہا، ناگہاں یوں مٹ گیا گویا کبھی تھا ہی نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ دولتِ عباسیہ کے آخری تاجدار مستعصم باللہ کی تخت نشینی سے بہت پہلے ہی عباسیوں کا سیاسی اقتدار ٹوٹ چکا تھا لیکن عوام کی عقیدات اور محبت کم و بیش بحال کی توں قائم تھی کوئی شک نہیں کہ خاندان کی تباہی میں خود مستعصم کی سیرت کی کمزوریاں بھی شریک تھیں کہ تاریخی زوال کے جہنم میں بھی دراصل لوگ سے

'اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں'

لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مستعصم کے اہل دربار اور ارباب اقتدار اگر خود غرض نہ ہوتے اور ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ میں مصروف نہ رہتے تو غالباً منگولوں کی فوج کو شکست دی جاسکتی تھی۔

زوال دولت عباسیہ کے سلسلہ میں یہ مسئلہ کم و بیش ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا ہے کہ مستعصم کا وزیر ابن العلقمی بنو عباس کی بربادی میں کس حد تک دخیل تھا۔

اگرچہ چنگیز خاں نے سلطان علاء الدین خوارزمی کو شکست فاش دینے کے بعد اور کم و بیش تمام خوارزمی مقبوضات کو زیرنگیں کرنے کے بعد دولتِ عباسیہ کی استیصال کے لئے گویا راستہ صاف کردیا تھا لیکن چنگیز خاں کے جانشین اپنے جھگڑوں میں اس طرح اُلجھے رہے کہ ۶۵۱ھ سے پہلے بغداد کو فتح کرنے کا مسئلہ معرض تعویق میں پڑا رہا۔ ۶۵۱ھ میں ہلاکو خاں کو دو مہمات کی تکمیل پر مامور کیا گیا۔ یعنی اسمٰعیلی فرقہ کا استیصال اور بغداد کی تسخیر ہلاکو ۶۵۱ھ میں لاؤ لشکر لے کر منگولستان سے نکلا لیکن ایران پہنچتے پہنچتے اسے تین سال لگ گئے ۶۵۴ھ میں اس نے ایران کے اسمٰعیلیوں کا زور توڑ دیا اور اس طرف سے بالکل بے فکر ہو کر اب وہ اپنی اصلی مہم کی طرف متوجہ ہوا منگو قاآن (فرمانروائے کل مغول) کا حکم تھا کہ یا تو خلیفہ عباسی کو منگولوں کی متابعت پر آمادہ کیا جائے، یا پھر اس سے وہی سلوک کیا جائے جو سرکشوں سے کیا جاتا ہے تو ہلاکو خاں اسمٰعیلیوں کا زور توڑنے کے بعد طے شدہ نقشہ جنگ کے مطابق بغداد[1] کی طرف بڑھا، ان دنوں مسند حکومت پر ابو احمد عبداللہ متمکن تھا کہ مستعصم باللہ کے لقب سے زیادہ مشہور رہے

۱؎ بغداد: اس شہر کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ نوشیرواں عادل نے تعمیر کرادیا تھا اس کے غریب ایک باغ میں وہ مقدمات کے فیصلے کرتا تھا شہر کو بھی باغ داد کہنے لگے یہ غلط صریح ہے بغداد دو کلمات سے مرکب ہے بغ + داد۔ بغ کے معنے بت، دیوتا اور خدا کے ہیں فغ بھی اسکی ایک شکل ہے چنانچہ فغفور چین کے معنے ہیں چین کے دیوتا کا بیٹا (اس کلمے کی ایک شکل بغپور بھی ہے) بغداد دراصل داد بغ ہے جیسے شاہان شاہ، شاہ شاہاں ہے فارسی قدیم میں اضافت کی یہی شکل تھی اس کے معنی ہیں خداؤں کا عطیہ بغداد میں دیوی استرتی یا ناھیہ (اناھیتہ) کا مندر تھا اس اعتبار سے یہ شہر بغداد یا داد بغ کہلاتا ہے۔ دیکھئے برہان قاطع محمد معین طہران ۱۳۳۰ شمسی صفحات ۱۸۸/۱۸۹

(اسکی تفصیل آگے آتی ہے) اس بدنصیب عباسی بادشاہ کی قسمت میں لکھا تھا کہ آل عباس کا آخری تاجدار کہلائے اور ہلاکو خاں کے ہاتھوں مارا جائے۔

ان دنوں خلیفہ عباسی کے اقتدار ارکان دولت میں یہ لوگ شامل تھے:

(۱) موید بن العلقمی وزیر: یہ شیعہ تھا اور مذہبی معاملات میں تعصب رکھتا تھا کچھ ایسے ناخوشگوار حالات ہو چکے تھے کہ اس کا دل خلیفہ کی طرف سے صاف نہ تھا ارکان دربار بھی اس کا مناسب احترام نہیں کرتے تھے صاحب تاریخ وصاف نے تو بہ تخصیص کہا ہے کہ خلیفہ عباسی کے درباری وزیر کو خاطر میں نہ لاتے تھے بہرحال ایک تو یہ کہ خود العلقمی، خلیفہ کی طرف سے بدظن تھا اور دوسرے یہ کہ مقتدر ارکان دولت میں مخاصمت تھی، اور وہ ایک دوسرے کی بیخ کنی کے درپے رہتے تھے۔

(۲) سلیمان شاہ ترکمان (کہ طائفہ ایوائی کا سرگروہ تھا) نفوذ و اقتدار کے اعتبار سے وزیر سے کسی طرح کم نہ تھا اور خلیفہ کو بھی اس پہ اعتماد تھا۔ (۳) مجاہد الدین ایبک دواندار: مدبر اور سیاستدان بھی تھا اور مجاہد بھی اس کی شجاعت اور ثابت قدمی مشہور تھی لیکن وہ بھی خلیفہ کی طرف سے صاف نہ تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی جگہ خاندان عباسی کے کسی اور رکن کو مسند خلافت پر متمکن کر دے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے بہت سے طرفدار جمع کر لئے تھے، ابن العلقمی نے خلیفہ کی خدمت میں یہ باتیں گوش گزار کیں تو اس نے مجاہد الدین کو بلا کر سب کچھ بتا دیا اور ساتھ ہی نصیحت کی کہ وفادار ملازم آقا سے یہ سلوک نہیں کیا کرتے، ایبک نے یہ بات سنی تو فوراً کہا کہ یا امیر المومنین آپ کو ابن العلقمی گمراہ کرتا ہے وہ تو خود ہلاکو خاں سے ساز باز کر رہا ہے کہ منگول ادھر آ کر بغداد پر بھی قبضہ کر لیں اس واقعہ کے بعد مجاہد الدین، خلیفہ اور ابن العلقمی دونوں سے سخت بدظن ہو گیا عباس اقبال[۱] تاریخ مفصل ایران میں تصریح کرتے ہیں کہ اس کے بعد بغداد میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اہل سنت والجماعت اور شیعوں کے درمیان مدت سے جو فساد چلا آ رہا تھا ارکان دولت نے اپنے اغراض کیلئے اس کی آگ کو بھی ہوا دی، خلیفہ بیچارا نہ جانے ماندن نہ پائے رفتن کے سے عالم میں گرفتار ہوا تو آخر دواندار یعنی مجاہد الدین ہی کو کہلا بھیجا کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم پر دشمنوں نے تہمت لگائی ہے اب تم اس فتنہ و فساد کو جس طرح بھی ہو سکے فرو کرو پھر مجاہد الدین کو بلا کر اسے خلعت عطا کیا میٹھی میٹھی باتیں کیں مختصر یہ کہ ہر طرح دواندار پر یہ بات روشن ہو گئی کہ خلیفہ بے دست و پا ہے اور میرے نفوذ و اقتدار سے فائدہ اٹھائے بغیر حکومت کے کام نہیں چلا سکتا۔

ہلاکو خاں عراق سے لشکر جرار لے کر پہلے ہمدان پہنچا اسکے ساتھ بدر الدین لولو صاحب موصل (۶۵۷ھ-۶۱۶ھ) اتابک ابوبکر بن سعد[۲] اتابک فارس خواجہ نصیر الدین طوسی اور عطا ملک جوینی بھی تھے۔ ہلاکو خاں کوئی دس ماہ کے قریب ہمدان اور کرمان شاہ کے گرد و نواح میں خیمہ زن رہا۔ اور لشکر کشی کا انتظام کرتا رہا اس کے باوجود ارکان دولت عباس کے کان پر جوں تک نہ رینگی کہ تغلب برم سر پہ کھڑی تھی اور یہ لوگ آنکھیں بند کئے کسی اور ہی دنیا میں بستے تھے۔ روایت ہے کہ بغداد پر چڑھائی کرنے اور خلیفہ عباسی کو راہ سے ہٹا دینے کے جن دنوں فیصلے ہو رہے تھے ان دنوں ہلاکو خاں خود بہت پریشان اور مضطرب الحال رہتا تھا وہ اس بات سے خوفزدہ تھا کہ آخری خلیفہ عباسی

---

[۱] تاریخ مفصل ایران، عباس اقبال (جزو اول) طہران ۱۳۱۲ شمسی صفحہ ۱۸۰۔ [۲] اتابک ابوبکر بن سعد (۶۵۸ھ/۶۲۳ھ) فارس کے اتابکوں میں غالباً سب سے زیادہ ذہین اور فطین تھا اس کی حکمت عملی سے فارس کا علاقہ منگولوں کی تاخت و تاراج سے کلیۃً محفوظ رہا یہ وہی خوش اقبال اتابک ہے جسکے لڑکے سعد (یعنی سعد بن ابوبکر بن زنگی) کے نام پر سعدی نے اپنا تخلص رکھا تھا مورخوں کو پوتے پردادے کا اشتباہ ہوا ہے کہ سعد بن زنگی کو سعدی کا ممدوح خیال کرتے تھے۔

آلِ رسول ہے اور تمام دُنیا کے مُسلمانوں کی نظروں میں محترم اور عزیز ہے معلوم نہیں اس کے ممالک پر چڑھائی کی گئی اور اس کو ہلاک کرنیکا بندوبست کیا گیا تو اس فعل کے نتائج کیا برآمد ہونگے اس کے علاوہ ہلاکو خاں خود بھی غائت درجہ توہم پرست اور زیرک ہونیکے باوجود کچھ سست بھی تھا خارج میں کچھ سنک سی تھی شراب نوشی اور عیش کوشی میں مشغول ہوتا تو پھر مہینوں یہی سلسلہ جاری رہتا۔ اور کسی اور کام کی دُھن سمائی تو دُوسرے سب کام چھوڑ چھاڑ کے نئے کام کے درپے اس طرح ہوتا گویا اور کوئی کام ہی نہیں ہے چنانچہ ہلاکو خاں نے نجومیوں سے مشورہ کیا عام طور پر نجومی، بغداد پر چڑھائی کے خلاف تھے اور ہلاکو خاں سخت متامل تھا عام طور پر یہ مشہور رہے کہ اس موقعے پر نصیر الدین طوسی نے ہلاکو خاں کو مشورہ دیا تھا کہ بے خوف و خطر آگے بڑھنا چاہیئے اور آلِ عباس کے جاہ و جلال سے بالکل متاثر نہیں ہونا چاہیئے سال ۶۵۵ھ تھا رمضان کے مہینے کی دسویں تاریخ تھی کہ ہلاکو خاں نے گویا آخری بار (کہ اس سے پہلے بھی گفت و شنید کے مرحلے طے ہو چکے تھے) اپنا ایلچی خلیفہ عباسی کی خدمت میں بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ متابعت قبول کرلو اور جان بچاؤ خود ہماری خدمت میں حاضر ہو اور اگر یہ کسی طرح ممکن نہیں تو سلیمان شاہ ترکمان، ابن العلقمی اور دواتدار کو چک (مجاہد الدین) کو بھیج دیا جائے کہ ہلاکو خاں کے پیغام بطریقِ احسن خلیفہ عباسی تک پہنچا سکیں۔ ابن العلقمی کا مشورہ یہ تھا کہ گراں بہا تحائف ہلاکو خاں کی خدمت میں بھیجے جائیں اور متابعت کر لی جائے یا کم از کم صلح کی کوئی صورت نکالی جائے۔ لیکن یا تو دُوسرے ارکانِ دولت نے اختلاف کیا یا خود خلیفہ اس اہانت پر راضی نہ ہُوا کہ آخر آلِ عباس کا نامدار تھا بہرحال صلح کی بیل منڈھے نہ چڑھی جب ہلاکو نے سلیمان خان اور ابن العلقمی کو طلب کیا تو خلیفہ نے انکی بجائے دو اور آدمی ارسال کئے جن میں سے ایک شرف الدین عبداللہ ابن الجوزی تھا۔ (یہ شخص محی الدین ابو محمد یوسف (۵۸۰ھ – ۶۵۶ھ) کا بیٹا اور ابو الفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی کا پوتا ہے اور وہی مشہور واعظ ہے جو سعدی کا اُستاد تھا اور جس کے متعلق بعض مورخوں کو اشتباہ ہُوا ہے یعنی پوتے کو دادا سمجھ لیا گیا ہے) یہ ابن الجوزی ہلاکو خاں کی خدمت میں پہنچا تو خلیفہ عباسی کے ارشاد کے مطابق منگول شہنشاہ کو ڈرانا چاہا اور کہا کہ جن لوگوں نے آلِ عباس کو ذلیل کرنا چاہا ہے یا انکی مملکت کو مسخر کرنے کی کوشش کی ہے ان کا انجام بہت دردناک ہُوا ہے ہلاکو خاں نے یہ طفلانہ باتیں سنیں تو تاؤ میں آگیا اور مختصراً یہ جواب دیا کہ واپس چلے جاؤ اور اپنے آقا کو متابعت کی ترغیب دلاؤ ورنہ جو ہو گا تم دیکھ ہی لوگے اور اس واقعہ کے بعد کچھ لوگوں نے چاہا (اور عباس اقبال کی تصریح کے مطابق ابن العلقمی بھی ان میں شامل تھا) کہ صلح ہو جائے لیکن مجاہد الدین اور فوج کے لوگوں نے اہانت گوارا نہ کی اور کہا کہ اس بات کا فیصلہ لڑائی کے ذریعہ ہونا چاہیئے (اس مشورے میں خلوص کہاں تک کارفرما تھا اور ابن العلقمی کی مخالفت کس حد تک دخیل تھی ایک الجھا ہُوا سوال ہے جس کا جواب اس وقت دینا مشکل ہے)۔

ادھر ہلاکو خاں کو بھی یقین ہو گیا کہ لڑائی ہو کر رہیگی۔ اس نے عراق کے سرحدی حاکموں اور کوہستانِ عراق کے مقتدر لوگوں کو روپیہ کا لالچ دے کر یا کسی شہر کی حکومت کے سبز باغ دکھا کر انھیں اپنے ساتھ ملایا اور پھر جنگ کے نقشہ کی صورت پر غور و خوض شروع ہوا قرار یہ پایا کہ جورماغون (یہ وہی سردار ہے جس کا ذکر پہلے سلطان جلال الدین منکبرنی کے سلسلہ میں آچکا ہے) اور بایجو اپنا اپنا لشکر لیکر بلادِ رُوم کی طرف سے اربل اور موصل پر بڑھیں اور مغرب کی طرف بغداد کا محاصرہ کریں۔ ادھر ہلاکو خاں نے ان کردوں کو اپنے

---

[1] دیکھئے۔ سایکس، تاریخ ایران جلد دوم صفحہ ۹۶۔

ساتھ ملالیا جو سلیمان شاہ (رکنِ دولت عباسی) کی ہوا خواہی کا دم بھرتے تھے جب ہلاکو خاں کو اس طرف سے اطمینان کامل نصیب ہو گیا تو فیصلہ کیا کہ خود اپنی فوج لے کر بغداد کے مشرق کی طرف خیمہ زن ہو گا سوغونجاق نویاں کہ منگول سرداروں میں شجاعت اور دلاوری میں مشہور تھا کچھ منگول شہزادوں کے ساتھ بغداد پر بڑھا کیتو بوقا اور اس کے ساتھی سرداروں کو حکم دیا گیا کہ لرستان اور خوزستان کی طرف سے بغداد کی طرف کوچ کریں، ہلاکو خاں خود حلوان کے راستے آگے بڑھا راہ میں ایک بار پھر ایلچی روانہ کیا اور خلیفہ عباس کو متابعت کی ترغیب دلائی لیکن خلیفہ نے جواب دیا کہ اپنی فوج کے متفرق ہونے کا حکم دو اور اس کے بعد جتنا روپیہ چاہو گے خراج کے طور پر سال کے سال ادا کر دیا جائے گا ہلاکو خاں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا کیتو بوقا لرستان کو پامال کرتا ہوا جنوب کی طرف سے وارد عراق ہوا۔

صاحب تاریخ وصاف[1] لکھتے ہیں کہ جب یہ اطلاع ملی کہ سوغونجاق اور ایلخانی لشکر کے دوسرے امرا مغرب کی سمت سے بغداد پر بڑھ رہے ہیں تو خلیفہ نے فتح الدین اور مجاہد الدین ایبک دواندار (دواندار صغیر بہ الفاظ صاحب تاریخ وصاف) کو دس ہزار سپاہی دے کر مدافعت کے لئے روانہ کیا لڑائی شروع ہوئی تو خلیفہ کی فوج کا پلہ بھاری رہا اور منگول پیچھے ہٹے اس موقعے پر فتح الدین نے کہ دنیا کے نشیب و فراز سے خوب آگاہ تھا مجاہد الدین کو یہ مشورہ دیا کہ اسی مقام پر خیمہ زن ہو کر دشمن کا انتظار کرنا چاہیئے اور خلیفۃ المسلمین کو فتح کی اطلاع دینا چاہیئے۔ مجاہد الدین جوانی کی شوریدہ سری میں ہنکارنے لگا کہ اب تو وقت ہے کہ دشمن کا پیچھا کیا جائے اور کلیتہً منگولوں کی فوجوں کا استیصال کر دیا جائے، اس کے احکام کے ماتحت خلیفہ کی تھکی ہوئی فوج پھر آگے بڑھی دجیل کے مقام پر دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں دن بھر کانٹے کی تول لڑائی ہوتی رہی رات ہوئی تو منگولوں نے دریائے فرات کا پانی اس طرح کاٹ دیا کہ دریا نے خلیفہ کی فوجوں کے خیموں کا رخ کر لیا بیشتر آدمی ڈوب کر مر گئے فتح الدین بھی انہی میں تھا دواندار کچھ ملازموں کے ساتھ افتاں و خیزاں پریشان حال واپس بغداد پہنچا خلیفہ نے رکنِ دولت کا یہ حال دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ جان بچ تو گیا۔

۲۲ محرم ۶۵۶ھ سے بغداد کا محاصرہ شروع ہو گیا بایجو، سوغونجاق کیتو بوقا اور ہلاکو کی فوجوں کے دستے چاروں طرف متعین کر دیئے گئے۔ ابھی تک خلیفہ کو یہ گمان تھا کہ بغداد بہت مستحکم شہر ہے اور اگر منگول خدانخواستہ شہر کے اندر داخل ہو بھی گئے تو عورتیں اور بچے ہی پتھر اڑ کے ان کو ہلاک کر دیں گے کچھ دنوں بعد جب حقیقت کا خوفناک چہرہ نظر آیا اور معلوم ہوا کہ منگولوں سے صلح کرنے ہی میں مصلحت ہے تو مجبور ہو کر آخر کار دواندار اور سلیمان شاہ کو ہلاکو خاں کے دربار میں روانہ کیا کہ صلح کی شرائط طے کریں لیکن اب معاملہ گفت و شنید اور صلح صفائی کے مرحلوں سے گزر چکا تھا۔ ہلاکو نے دونوں ارکان دولت کو واپس بغداد بھیج دیا کہ آپ کے جو خاص لوگ ہیں اور جن کی جان آپ بچانا چاہتے ہیں ان کو بھی شہر سے باہر لے آیئے تاکہ ان سے نفری کا کام لیا جا سکے اور ان کے گروہ حشر بنا کر مصر و شام کی طرف روانہ کئے جا سکیں۔ جب دواندار اور سلیمان شاہ شہر کے بہت سے بے قصور باشندوں کو لے کر باہر آئے تو ہلاکو خاں نے کمال بے پروائی سے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور کچھ دنوں کے بعد دواندار، سلیمان شاہ اور اس کے بیٹے کو بھی قتل کروا دیا ان مقتولوں کے سر بدر الدین لولو صاحب موصل کے بیٹے کے ہاتھ موصل بھیج دیئے گئے اور بیچارے بدر الدین نے (اس کے باوصف کہ سلیمان شاہ کا دوست تھا) ہلاکو خاں کے ڈر کے مارے ان مقتولوں کے جسد ہائے خاکی کی بے حرمتی کی۔

---

[1] تاریخ وصاف (نسخہ مملوکہ دانش گاہ پنجاب ۱۸۵۶ء) صفحہ ۶۴ بہ بعد۔ WIEN BAND. 1

سن ۶۵۶ھ تھا صفر کے مہینے کی چوتھی تاریخ تھی کہ مستعصم باللہ[1] اپنے تین بیٹے اور تین ہزار کے قریب کا بر و عمائدے کر ہلاکو خاں کی خدمت میں حاضر ہوا ہلاکو نے خلیفہ سے بات کی تو نرمی سے کی اور کہا کہ اب اپنے شہر کے لوگوں کو قتل و جدال سے روکو خلیفہ نے احکام جاری کئے کہ اب بغداد کی مدافعت بیکار ہے لوگوں نے لڑنا بند کر دیا، ہلاکو خان نے اس بہانے کہ بغداد کی مردم شماری ہو جانی چاہیئے بہت سے لوگوں کو شہر سے باہر بلوایا اور سب کو ہلاک کروا دیا۔ اس تاریخ سے یعنی صفر کی چوتھی تاریخ سے بغداد میں قتل عام شروع ہوا۔ غارتگری ابھی پورے زور پر تھی کہ صفر کی ۹ تاریخ کو ہلاکو بغداد شہر میں داخل ہوا، اور خلیفہ نے خود اپنے تمام خزائن کی کنجیاں منگول فرمانروا کے سامنے رکھدیں۔

بغداد کی تباہی کی تصویر صاحب تاریخ وصاف نے کھینچی ہے اور اگرچہ ان کا اسلوب نگارش نہایت پُر تکلف اور پُر تصنع ہے اور وہ پیچیدہ استعارات اور دقیق تشبیہات کے سوا بات کرنا پسند نہیں کرتے لیکن پھر بھی اس موقعہ پر اس تکلف اور تصنع کے پردے کے پیچھے سے وہ قیامت جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو بغداد پر گذر گئی وہ لکھتے ہیں کہ منگول وحشی اتنا بھی نہیں کرتے تھے کہ اطمینان سے مال غنیمت کے متعلق کوئی بات ہی طے کر لیں۔ ریشمی پردے اور مرصع فرش چھری سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ حرم سراؤں سے عورتوں کو مو کشاں بازاروں اور گلیوں میں لے آتے تھے یا تو بغداد خاقانی کے اس شعر کا مصداق تھا کہ ؎

ذات العماد خرم - خیر البلاد عالم　　بیت الحرام ثانی دار السلام اصغر

اور یا یہ حالت ہوئی کہ یہ شہر یوں غارت ہوا گویا کبھی تھا ہی نہیں خلیفہ کے مطبخ اور آبدار خانے سے جو سونے اور چاندی کے برتن لوٹے گئے ان کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ کوڑیوں کے مول بکتے تھے اور کوئی گاہک نہ ملتا تھا۔

عباس اقبال خواجہ نصیر الدین[2] طوسی سے نقل کرتے ہیں کہ ہلاکو کے حکم سے خلیفہ کے سامنے ایک طبق زر رکھا گیا اور کہا گیا کہ نوش جان فرمایئے بچارے نے کہا سونا کس طرح کھایا جائے ہلاکو نے کہا کہ سونا کھانے کے کام نہیں آتا تو کچھ اور کام تو اس سے لیا ہوتا اپنی فوج کے لوگوں میں تقسیم کیا ہوتا (کہ جان پر کھیل کھیل جاتے) خلیفہ نے کہا خدا کا منشا یہی تھا یہ تقدیر الٰہی ہے۔ ہلاکو نے کہا اب جو کچھ ہوگا (تم پر جو کچھ بیتیگی) وہ بھی عین تقدیر الٰہی ہوگی۔ صفر کے مہینے کی چودہ تاریخ کو خلیفہ کا کام تمام کر دیا گیا، دوسرے دن دروازہ کلواز کے پاس اس کے لڑکے اور ساتھیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ خود عباس اقبال[3] کا بیان یہ ہے کہ خلیفہ کو ۱۴ صفر کے دن شہید کیا گیا ہے اور اس کا لڑکا ابوبکر بھی اسی دن مقتول ہوا ہے منجھلا لڑکا کچھ دن بعد مارا گیا۔ سب سے چھوٹا لڑکا مبارک شاہ تھا اسے ہلاکو نے اپنی بیوی کے حوالے کر دیا اُس نے اس شہزادے کی تربیت نصیر الدین طوسی کے سپرد کر دی اور جب وہ جوان ہوا تو ایک منگول امیرزادی سے اس کا نکاح کر دیا گیا۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ بغداد میں کم از کم آٹھ لاکھ نفوس ہلاک ہوئے خلیفہ عباسی کی ہلاکت کے متعلق متعدد روایات مشہور ہیں (یعنی

---

[1] تاریخ مفصل ایران جزو اول عباس اقبال صفحہ ۱۸۴ لیکن صاحب تاریخ وصاف (صفحہ ۷۳) قمطراز ہیں کہ خلیفہ کے ساتھ دو شاہزادے تھے یعنی ابوبکر اور عبدالرحمن وصاف کے مطابق بھی جب خلیفہ ہلاکو خان کے پاس پہنچا ہے تو سلیمان شاہ زندہ تھا۔ سیاق و سباق عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

[2] عباس اقبال تاریخ مفصل ایران جزو اول صفحہ ۱۸۳ (عبارت منقول از رسالہ کوچک فتح بغداد منسوب بر خواجہ نصیر الدین طوسی)۔

[3] تاریخ مفصل ایران - عباس اقبال صفحہ ۱۸۵۔

اس کی ہلاکت کے طریقہ کے متعلق (انگریزی کے مشہور شاعر[1] لانگ فیلو نے اپنی ایک نظم میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ خلیفہ کو بھوکوں مارا گیا تھا لیکن یہ غلط معلوم ہوتا ہے اور زیادہ قرین قیاس وہی روایت ہے جو اکثر مسلمان مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ خلیفہ کو ایک نمدے میں لپیٹ دیا گیا۔ اور پھر یا تو اسے پہاڑ کی چوٹی پر سے دھکا دیا گیا یا نمدے پر سخت ضربیں لگائی گئیں تا ایں کہ بدنصیب خلیفہ خدا کو پیارا ہو گیا۔ اس روایت کی یوں بھی تائید ہوتی ہے کہ منگول بادشاہوں کا خون بہانا منحوس خیال کرتے تھے اور اپنے کسی شاہی خاندان کے فرد کو ہلاک کرنا چاہتے تھے تو گردن نہیں مارتے، بلکہ کمر توڑ دیتے تھے، کہ خون نہ بہنے پائے۔ اگرچہ پروفیسر[2] براؤن لانگ فیلو کی روایت کی تکذیب کرتے ہیں لیکن عجب اتفاق ہے کہ اس مغربی روایت کے کچھ خدوخال اس روایت سے مشابہ ہیں جو صاحب تاریخ وصاف نے بیان کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خلیفہ کو بھوکا رکھا گیا اور جب اس نے بھوک سے بیتاب ہو کر کھانا طلب کیا تو طبق زر اس کے سامنے رکھا گیا۔ نمدے میں لپیٹنے کے متعلق براؤن اور وصاف ہم آواز ہیں اور یہ بالکل طے شدہ سمجھنا چاہیئے کہ خلیفہ کی گردن نہیں ماری گئی بلکہ اسے نمدے میں لپیٹ کر ضربات مسلسل سے بے حال کر کے ہلاک کر دیا گیا۔

صاحب[3] تاریخ وصاف تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس بات کے متعلق مشورہ ہوتا رہا کہ خلیفہ کو ہلاک کیا جائے یا اسکی جان بخشی کر دی جائے، ہلاکو کے مشیروں نے کہا کہ اگر خلیفہ زندہ رہا تو لوگ خواہ مخواہ اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور فتنہ و فساد کے ابواب وا ہونگے اس لئے ہلاک کروا دینا ہی مناسب ہے۔ یہ روایت[4] بھی مشہور ہے کہ نصیر الدین طوسی نے خلیفہ کی جان بخشی کی تجویز کی سخت مخالفت کی بلکہ یہاں تک کہا کہ اس کی گردن بھی ماری جائے تو کچھ نہ ہو گا کہ قوانین طبعی اس قسم کے حادثات سے بالکل متاثر نہیں ہوتے ورنہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد (کہ رسولِ پاکؐ کے نواسے تھے) خدا جانے کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔

آل عباس کا آخری تاجدار جس نے ۶۴۰ھ میں مسند حکومت پر جلوس کیا تھا عباس اقبال کے الفاظ میں "متدین، نیکوکار، عفیف، خوش اخلاق، کتاب دوست اور خوشخط شخص تھا اور امور سیاست سے ناواقف ... کسی شخص کے دل میں اس کی ہیبت قائم نہ تھی، اس کا اکثر وقت یوں صرف ہوتا کہ یا تو گانا سنانے والی (خوش گلو) کنیزوں کی محفل برپا ہے یا مسخرے بھانڈ خوش فعلیاں کر رہے ہیں یا پھر بہت ہوا تو اپنے کتب خانے میں چلا جاتا تھا اور یہاں بھی مطالعے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا منگول بغداد کے دروازے پر گویا دستک دے رہے تھے اور وہ تھا کہ ہمسایہ بادشاہوں کو خط لکھ رہا تھا کہ فلاں گویا میرے حضور میں بھیجو یا فلاں سازنواز کو ادھر روانہ کر دو۔"

اہل دربار ایک دوسرے کی بیخ کنی پر تلے ہوئے تھے خلیفہ گویا سولہ سال تک بے خبر اور عیش و عشرت میں مدہوش رہا۔ صورت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ جب اس کے سامنے منگولوں کی فتوحات کا ذکر چلتا تھا تو بجائے اسکے کہ دوسرے ممالک اسلامی کے فرمانرواؤں سے رابطہ پیدا کرے اور منگولوں کے سیلاب کو روکنے کا انتظام کرے، یہ کہہ دیا کرتا کہ میرے لئے تو بغداد ہی کافی ہے اور جب منگولوں کو معلوم ہو جائیگا کہ مجھے اور کسی ملک کی خواہش نہیں ہے تو وہ بغداد کو مسخر کرنے سے رک جائیں گے ۶۴۲ھ میں منگول افواج کا ایک دستہ بغداد کی طرف بھی

---

[1] تاریخ ادبیات ایران۔ جلد دوم۔ تالیف پروفیسر براؤن صفحہ ۴۶۳۔ [2] تاریخ وصاف صفحہ ۷۷۔ [3] تاریخ وصاف صفحات ۷۹-۷۸۔

[4] اس روایت کا مستند ماخذ مجھے کوئی نہیں ملا لیکن درست معلوم ہوتی ہے اور طوسی کی طبیعت اور مزاج کے مطابق۔

آیا تھا لیکن شرف الدین اقبال شرابی اور ابن العلقمی نے مدافعت کا ایسا اچھا انتظام کیا کہ منگولوں کے دانت کھٹے ہو گئے اور وہ لوٹ گئے لیکن اس وقت تک بغداد میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی نہ ابن العلقمی اور دوادار کی مخالفت اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ سلطنت کے زوال کا باعث ہو جاتی۔ ۶۵۰ھ[1] کے بعد سنی شیعہ فساد نے وہ دردناک صورت حال پیدا کی جس کی بنا پر ابن العلقمی کی بدظنی نے اور خانہ جنگی نے گویا مملکت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

پروفیسر براؤن (کتاب الفخری[2] کے مندرجات کی بنا پر) سیرت مستعصم کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آل عباس کا آخری تاجدار شریف اور خوش اخلاق تو ضرور تھا لیکن امور مملکت داری سے آگاہ نہ تھا اور ان پیچیدہ مسائل کو سمجھانے کی اہلیت سے عاری تھا۔ جو اس کے عہدِ حکومت میں پیدا ہو گئے تھے۔ دوسرے مستشرق[3] بھی خلیفہ کی بے تدبیری کا بصراحت ذکر کرتے ہیں (اور ان سے کیا شکایت ہے اپنے بھی بار بار آخری تاجدار آل عباس کی غفلت اور بے پروائی کا رونا روتے ہیں)۔

ہندوشاہ[4] نخجوانی رقمطراز ہیں کہ مستعصم نیکو خواہ و متدین تھا — لیکن امور مملکت داری سے ناواقف اور اسکے احباب میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کو بجا طور پر نقدرا کہا جا سکتا ہے۔

صاحب تاریخ وصاف بھی (جو ابن العلقمی کے سخت مخالف ہیں اور جن پر مستعصم کی بیجا مخالفت کا الزام نہیں دھرا جا سکتا کہ وہ تو خلافت عباسیہ کی تباہی کا ذمہ دار سراسر ابن العلقمی کو گردانتے ہیں) مستعصم کی عشرت کوشی اور بے پروائی کا (اس حالت میں کہ دشمن سر پہ کھڑا ہے) بصراحت ذکر کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> وخود به الحان استماع خوش واجتماع با جواری چوں دراری ومشاہدۂ غلمان حوراوش وتلذذ بہ انواع ملاہی اشتغال نمود۔ از ثغور بعض کو اعب بضبط ثغور وبعض قواضب پرداخت۔ در قبول قول راست از پردہ سازئ مخالف معرض گشت نہ برکت رائے برکت عاقبت اندیشی اندوزگار ادراک نکرد وفلک مرتوت ایں شعوذہ وتعزیب در فرجام کار خود کرانکرد۔[5]

اس اقتباس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں لیکن سچ پوچھئے تو آل عباس میں کئی تاجدار ایسے گزرے ہیں جو مستعصم سے بھی زیادہ لہو و لعب کے دلدادہ اور عیش کوش تھے یہ صاحب اس لئے خوفناک معلوم ہوتے ہیں کہ اتفاق سے وہ آل عباس کا آخری تاجدار رہے اور اس کی زندگی، سیرت اور کردار پر تاریخ نے نسبتاً تیز روشنی ڈالی ہے جن باتوں کے لئے مستعصم بدنام ہے وہ اپنی جگہ پر درست ہیں اور اخلاقی معائب میں شامل ہیں لیکن اس قسم کے اشتغال میں مبتلا ہونے کی سزا اور کسی عباسی خلیفہ کو نہ ملی مستعصم کو تقدیر نے اس بدنصیبی اور حرمان کے لئے مخصوص کر دیا کہ ایک بہت بڑی سلطنت کا آخری بادشاہ کہلائے اور بُری طرح ہلاک کر دیا جائے۔

ممکن ہے کہ اس موقعے پر کوئی اور سیاستدان اور بالغ النظر عباس بادشاہ مسند آرائے حکومت ہوتا تو منگولوں کو شکست دیکر

---

[1] تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال صفحات ۱۸۰–۱۷۸۔ [2] تاریخ ادبیات ایران، براؤن جلد دوم صفحہ ۴۶۵۔ [3] تاریخ ایران، تالیف پرسی سائیکس جلد دوم صفحہ ۹۹۔ [4] تجارب السلف، مرتبہ عباس اقبال صفحہ ۳۵۴۔ [5] تاریخ وصاف صفحات ۶۲–۶۱۔

لوٹا دیتا اور تاریخ کے واقعات کی شکل ہی دوسری ہوتی ۔

ہم یہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ ایک اُلجھا ہوا مسئلہ ہے کہ حادثہ بغداد میں اور استیصال خلافت عباسیہ میں ابن العلقمی بالواسطہ یا بلاواسطہ کس حد تک دخیل ہے اس سوال کا جواب دینا اس لئے مشکل تر ہو گیا ہے کہ خالص تاریخی مسئلہ کو مذہبی تعصبات سے اس طرح اُلجھا دیا گیا ہے کہ گرہ کشائی کی کوشش بیشتر بے سود نظر آتی ہے۔ پہلے تو یہ سُن لیجئے کہ مؤرخ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں ایک تو وُہ گروہ ہے جو وزیر کو اس معاملے میں بے قصور گردانتا ہے، اور دوسرا وہ گروہ ہے جو اسے کاذب، غدار اور ملعون تصور کرتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی اتنی بڑی سلطنت برباد کروا دینے کی سازش میں شرکت کی مورخوں کے یہ دو گروہ، تاریخی ماخذوں کی مختلف تعبیرات پر اختلاف رائے کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ایک گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ابن العلقمی شیعہ تھا ۔اس لئے اس نے خلیفہ سے بدظن ہو کر اہلِ سنّت و الجماعت کے سواد اعظم کے محورِ عقیدت کو مٹا دیا، دوسرا گروہ وزیر کے شیعہ ہونے کا معترف ہے اور اسے تمام الزامات بری قرار دیتا ہے مؤرخوں میں بھی جو اہل السنّت ہیں ان کا رجحان یہ ہے کہ ابن العلقمی کو قصور وار ثابت کریں اور جو شیعہ ہیں وہ وزیر کی تمام حرکات کا جواز پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں یوں مسئلہ اور بھی اُلجھ گیا ہے پہلے ان باتوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ابن العلقمی شیعہ تھا اور مذہب کے معاملہ میں متعصب ۔براؤن، عباس اقبال، صاحب تاریخ وصاف، صاحب کتاب الفخری، صاحب کتاب تجارب السلف سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں ۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ بغداد میں سُنی شیعہ فساد اکثر ہوتے رہتے تھے اور ارکانِ دولتِ عباسی اپنی اغراض کی خاطر فسادات کی آگ کو ہوا دیتے تھے ۔اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں، کہ دوانداز کی وجہ سے بغداد میں کتنا فتنہ برپا ہوا تھا مسلّم ہے کہ ۶۵۵ھ ہجری میں بڑے زور کا سُنی شیعہ فساد ہوا۔ خلیفہ نے اپنے بڑے بیٹے ابوبکر کو اس امر پہ مامور کیا کہ دونوں فریقوں میں صلح کرا دے کے فتنے کے ابواب ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں ۔ ابوبکر غایت بے تدبیری سے کام لے کر فساد کے شعلوں کو مزید ہوا دینے کا موجب ہوا ۔ اور بغداد کے شیعہ خلیفہ کی طرف سے بالعموم بدظن ہو گئے ۔ابن العلقمی جو بغداد کے شیعوں کا گویا سرگروہ تھا طبعاً رنجیدہ ہوا اور دل میں یہ رنج لئے رہا ۔ صاحب تاریخ وصاف لکھتے ہیں کہ وزیر کے دل میں کدورت کے اور اسباب بھی موجود تھے کہ ارکانِ دولت اس کا احترام نہیں کرتے تھے اور وزیر گویا اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا۔ صاحب تاریخ وصاف نے یہ بھی بہ تصریح لکھا ہے کہ ابن العلقمی نے ہلاکو خاں کو خطوط لکھے کہ بغداد آئیے ۔میں ایسا انتظام کروں گا کہ آپ کی فوجوں کو کوئی تکلیف نہ ہو گی اور شہر مسخر ہو جائیگا ۔ پھر جب ہلاکو خاں فوج لے کر آن پہنچا تو وزیر نے بادشاہ کے کان بھر کے فوج کے سپاہی متفرق کر دیئے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ہلاکو کے لئے بغداد کو مسخر کرنا سہل ہو گیا[۱]۔

صاحب طبقات ناصری کی بھی یہی رائے ہے اور پروفیسر براؤن، تمام واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابن العلقمی نے نصیر الدین طوسی کے ساتھ مل کر سازش کی ہو کہ آخری تاجدار آلِ عباس کو ہلاک کروا دیا جائے ۔ لیکن اُنھوں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ معاملہ بہر حال شک اور تذبذب سے خالی نہیں[۲] گویا ابن العلقمی کا گناہ گار ہونا مزید ثبوت کا محتاج ہے براؤن[۳] نے

۱۔ تاریخ وصاف صفحات ۸۰، ۵۸ ۔ ۲۔ تاریخ ادبیات ایران جلد دوم (براؤن) صفحات ۴۶۵/۴۶۶ ۔ ۳۔ ایضاً ۔ صفحہ ۴۶۴ ۔

صاحب کتاب الفخری کا بھی ذکر کر دیا ہے کہ وہ ابن العلقمی کا مداح ہے اور اسکی بے گناہی کا یہ ثبوت پیش کرتا ہے کہ منگول جب بغداد فتح کر چکے تو ابن العلقمی کو ایک اور منگول سردار کے ساتھ شہر کا حاکم مقرر کیا۔ درآں حال کہ وزیر اگر غدار ہوتا تو منگول کبھی اس پر بھروسہ نہ کرتے کیونکہ ایران کا شیوہ رہا ہے کہ منگول غداروں سے اچھا سلوک نہیں کرتے ہیں) یہ درست ہے لیکن اسکے ساتھ ہی پروفیسر براؤن یہ تنبیہ کر دیتے ہیں کہ صاحب کتاب الفخری شیعہ ہے اور اس لئے اگر وہ ابن العلقمی کی حمایت کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ یعنی مذہبی تعصب کی بنا پر۔ پروفیسر براؤن نے جو قیاس آرائی کی ہے وہ غلط ہو یا صحیح یہ علیحدہ سوال ہے۔ لیکن ابن العلقمی اور نصیر الدین طوسی کی سازش والا معاملہ کچھ مشکوک معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب تاریخ وصاف ابن العلقمی کے مخالف ہیں اور اسکی غداری کا صراحت سے ذکر کرتے ہیں لیکن نصیر الدین طوسی اور وزیر کی سازش کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے صرف یہی نہیں بلکہ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ نصیر الدین طوسی نے خلیفہ مستعصم باللہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ کر بغداد بھجوایا۔ ابن العلقمی کی نظر سے گزرا تو اس نے قصیدے کی پشت پر یہ لکھ دیا کہ طوسی خلیفہ بغداد سے مکاتیب و مراسلت کر رہا ہے اور اس کی تعریف میں قصیدے کہہ رہا ہے۔ ان باتوں کے نتائج سے ہوشیار رہنا چاہیئے اور قصیدہ، ناصر الدین محتشم قہستان کو بھیج دیا جنکی سلک خدمت میں طوسی ان دنوں منسلک تھا۔ (یہ وہی محتشم قہستان ہے جو ہلاکو کی ترغیب سے متابعت قبول کر لیتا ہے اور طوسی اسکی خدمت ترک کر کے ہلاکو خاں کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہے) ناصر الدین نے وزیر کا یہ خط پڑھا تو سخت برآشفتہ ہوا اور طوسی کو محبوس کر دیا ان حالات میں ابن العلقمی اور طوسی کا کسی سازش میں شریک ہونا بہ غایت مستبعد معلوم ہوتا ہے یوں بھی صاحب تاریخ وصاف طوسی کا نام ایسے ادب احترام اور خلوص سے لیتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ اسکے دل میں کم از کم یہ خیال تو نہ تھا کہ استیصال دولت عباسیہ میں طوسی بھی کسی طرح دخیل تھا[۱]۔ آقائے عباس اقبال نے بھی اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ آیا ابن العلقمی غدار تھا اور جو الزامات خلافت کو برباد کرنے کے اس پر لگائے جاتے ہیں درست ہیں پروفیسر براؤن کی طرح وہ بھی مؤرخوں کے متضاد اور متخالف بیان پڑھ کر اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آج اس سوال کا جواب دینا دشوار ہے کہ ابن العلقمی قصوروار تھا یا نہیں لیکن اگر پروفیسر اقبال عباس کی تحریر کے بین السطور پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انکی طبیعت کا رجحان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ وزیر نے واقعی تعصب مذہبی کی وجہ سے مملکت[۲] سے غداری کی۔

ہندو شاہ نخجوانی صاحب تجارب السلف نے ابن العلقمی کے جو واقعات قلمبند کئے ہیں ان سے بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ سخت تعصب مذہبی لکھتا تھا اگرچہ ہندو شاہ نے وزیر کی مدافعت کی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ ارکان دولت بادشاہ کے کان ابن العلقمی کے خلاف اس طرح بھرے تھے کہ اچھے مشوروں کا اثر نہیں ہوتا تھا، تاہم جو کچھ ہندو شاہ نے لکھا ہے اسے غور سے پڑھا جائے تو یہ ضرور روشن ہوگا کہ ابن العلقمی شیعیت میں سخت تعصب رکھتا تھا اور شیعہ علماء کے لئے جان تک دینے کو تیار تھا[۳]۔ ایسے شخص کی مذہبی حس کو ٹھیس لگے تو سخت ناگوار نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ اگرچہ بہ قطع و یقین تو کوئی فیصلہ صادر کرنا ناممکن ہے لیکن قرین صواب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وزیر نے خلیفہ کی طرف سے بدظن ہو کر اگر غداری نہیں کی تھی تو کم از کم مملکت کو بچانے کیلئے وہ تدابیر نہیں اختیار کی تھیں جو ایک وفادار اور تجربہ کار وزیر کے شایان شان ہوا کرتی ہیں ۔۔۔ موید الدین بن ابو طالب محمد بن احمد بن العلقمی اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں شمار[۴] ہوتا ہے۔ حسن خط میں اور شعر گوئی میں بھی اسے ملکہ حاصل تھا۔ انشا پردازی تو خیر گویا گھر کی لونڈی تھی کہ اس کے بغیر تو امور وزارت کا انصرام ہی ناممکن ہے اسے نہ صرف کتابیں جمع کرنیکا شوق تھا بلکہ شعراء ادباء کی تربیت اور پرورش میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہتا تھا اسکے کتب خانے میں دس ہزار نسخے تھے جو بیشتر نہایت گرانمایہ اور نفیس تھے اسکے اردگرد (ظاہر ہے) شعراء اور ادباء کا گویا جھرمٹ سا رہتا تھا، شاعر اسکی مدح میں قصیدے کہتے تھے انشا پرداز اس کے نام تصانیف منسوب کرتے تھے ان میں سے

۱ تاریخ وصاف صفحہ ۵۰ ۔ ۲ تاریخ مفصل ایران عباس اقبال صفحات ۱۸۸-۱۸۵ ۔ ۳ تجارب السلف تالیف ہندو شاہ نخجوانی مرتبہ آقا عباس اقبال طہران صفحات ۳۶۰-۳۵۴ ۔ ۴ تاریخ مفصل ایران عباس اقبال صفحہ ۱۸۵ ۔

مشہور ترین عزالدین ابن ابی الحدید ہے (۵۸۶ھ - ۶۵۵ھ) جس نے مشہور کتاب شرح نہج البلاغت (اصل کتاب حضرت علیؓ کے خطبات کا مجموعہ ہے) لکھ کر ابن العلقمی سے منسوب کی۔

آقائے عباس اقبال نے اپنا ماخذ نہیں بتایا ہے یہ ہم اسلئے عرض کرتے ہیں کہ تجارب السلف میں عزالدین اور اس کا بھائی موفق الدین بغداد کے قتلِ عام تک زندہ ملتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ صاحب تجارب السلف رقمطراز ہیں[۵۳] کہ جب ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغت ابن العلقمی سے منسوب کی اور کتاب پیش خدمت کی تو ابن العلقمی فرط مسرت سے پھولا نہ سمایا کتاب کی پسندیدگی میں مذہبی عقیدت کا رنگ بھی شامل تھا موقف کو جی کھول کر انعام دیا گراں بہا پارچات، ترک کنیز، حبشی غلام، مرصع استر، فرش چاندی کے برتن وغیرہ بغداد کے واقعے میں عزالدین مذکور (مولف کتاب) اور اس کا بھائی موفق الدین گرفتار ہوگئے اور قریب تھا کہ قتل ہو جائیں ابن العلقمی کو اطلاع ملی دوڑا دوڑا نصیر الدین طوسی کی خدمت میں پہنچا اور صورتِ حال سے مطلع کیا وہ وزیر کو ہلاکو کے پاس لے گیا۔ وہاں ابن العلقمی نے کہا کہ ان دونوں علما کو ہلاک کرنے کی بجائے مجھے ہلاک کروا دیا جائے، ہلاکو خان نے ہنس کر کہا تم کو ہلاک کروانا مقصود ہوتا تو تم آج تک زندہ سلامت ہوتے؟ یہ کہہ کر دونوں عالموں کی جان بخشی کے احکام صادر فرما دئے صاحب تجارب السلف ہی کے قول کے مطابق رضی الدین نے کتاب عباب اور مجمع البحرین (کہ لغت سے متعلق ہیں) بھی وزیر مذکور ہی کے نام سے منسوب کی ہیں۔ پروفیسر براؤن کا خیال[۵۴] ہے کہ واقعہ بغداد کے کچھ ماہ بعد ہی ابن العلقمی کا فوت ہو جانا خالی از علت نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب منگول اس بدنصیب وزیر سے کام لے چکے تو اس کا کام تمام کروا دیا لیکن اس واقعہ کیلئے بھی انھوں نے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ سایکس اور صاحب تجارب السلف اور عباس اقبال ابن العلقمی کی موت کو مرگ طبعی تصور کرتے ہیں صاحب وصاف[۵۵] یہ ضرور لکھتے ہیں کہ منگولوں نے ابن العلقمی کی توہین و تذلیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن بتصریح بیان نہیں کرتے کہ اسے ہلاک کروا دیا گیا۔ بہرحال اس نے ۶۵۶ھ (جمادی الاول) میں وفات پائی۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ تمام تاریخی ماخذ ٹٹولنے کے بعد ایک غیر جانبدار شخص کے دل میں یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ابن العلقمی نے ہلاکو خان کو بغداد پر چڑھائی کی دعوت نہیں دی تھی تو کم از کم یہ تو تھا کہ محاصرہ بغداد کے وقت مناسب اقدام نہیں کئے تھے۔ یہ ملک وملت کے ساتھ غداری ہے اور سچ پوچھئے تو غداری کے مدارج نہیں ہوتے غداری بہرحال غداری ہے، غداری کی یہ داستان اس لئے اور بھی عبرت ناک ہے کہ اس کا پس منظر مذہبی اختلاف تھا اور یہ اختلاف مذہبی، ایک دورانِ جلیل کی بربادی میں معاون ہوا، مذہبی تعصب اور تنگ نظری نے بڑے بڑے فتنے پیدا کئے ہیں لیکن غالباً زوالِ دولتِ عباسیہ کے سلسلہ میں مذہبی تعصب کی وجہ سے جو خونریزی ہوئی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ معمولی سے مذہبی اختلاف کی قربانگاہ پر آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ خدا آئندہ مسلمانوں کو مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے فتنوں سے محفوظ رکھے۔

---

۵۳ تجارب السلف مرتبہ عباس اقبال طہران صفحات ۳۵۸ تا ۳۶۰ - ۵۴ براؤن۔ تاریخ ادبیاتِ ایران جلد دوم صفحہ ۴۶۵ -

۵۵ تاریخ وصاف صفحہ ۲۸، ۳۰ بعض مورخ یہ بھی قلمبند کرتے ہیں کہ ابن العلقمی کو منگولوں نے ایک اور شخص کے ساتھ حاکم بغداد مقرر کر دیا تھا۔

۵۶ تجارب السلف صفحہ ۳۶۰ - اور سایکس براؤن اور تاریخ مفصل ایران تالیف عباس اقبال بھی دیکھئے -

محمد مظہر الدین صدیقی ایم اے۔

اسلامی دینیاتی عقائد کا ارتقاء

اسلام عرب سے باہر نکلا تو اس کے پاس کوئی لمبی چوڑی تفصیلی دینیات نہ تھی۔ عقائد کا ایک مختصر سا سرمایہ تھا جس پر عمل کی بنیاد رکھی گئی تھی، یہ عقائد نہایت سادہ اور فلسفیانہ موشگافیوں سے مبرّی تھے۔ اسی وجہ سے ان میں ابھی تک انجماد نہیں پیدا ہوا تھا۔ لیکن جب مغربی ایشیا کا ایک وسیع و عریض علاقہ اسلام کے زیر نگین آ گیا تو اسے متعدد متنوع اور مختلف الخیال دینیاتی نظامات اور عجیب و غریب مذہبی عقائد سے واسطہ پڑا۔ اس لئے اسلامی فکر پر مقامی مذاہب اور ان کے عقائد کا ردِ عمل ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی دینیاتی فکر مختلف طریقوں سے متشکل ہونا شروع ہوئی، حجاز میں جہاں یونانی فکر اور عیسائی یا زردشتی عقائد کا کوئی وجود نہ تھا، اسلام اپنی پہلی سی سادگی پر قائم اور فلسفیانہ موشگافیوں سے دور رہا، کیونکہ یہاں کوئی دینیاتی مباحث اور کلامی مسائل اس کے سامنے نہ تھے۔ لیکن شام میں یونانی فلسفہ اور عیسائی دینیات سے اس کا مقابلہ تھا۔ اس لئے یہاں اسلامی عقائد کی تعبیر و توجیہ میں یونانی فلسفہ اور عیسائی علم کلام کے اثرات کا داخل ہونا ضروری تھا۔ عراق میں ناستک فرقہ کے خیالات کا ردِ عمل ہوا۔ سرحد کے بدوی قبائل (خوارج) کے ہاتھوں میں اُس نے ایک انتہا پسندانہ اور غیر مصالحانہ دینیاتی نظام کی صورت اختیار کی۔ ایران میں ثنویت اور مجوسیت کا دور دورہ تھا۔ اس لئے یہاں اسلام اور ایرانی ثنویت کے امتزاج سے بڑے بڑے عجیب و غریب عقائد معرض وجود میں آئے۔ اس زمانہ میں کسی شخص کے لئے یہ پیش گوئی کرنا مشکل تھا کہ اس اختلاط و امتزاج عمل اور ردِ عمل کے نتیجہ میں مسلمانوں کے دینیاتی عقائد کی آخری شکل کیا ہو گی، اور راسخ العقیدگی کا اطلاق کس قسم کے دینی افکار پر کیا جائیگا۔ بالخصوص جبکہ مسلمانوں نے اپنی حکومت میں تمام مذہبی فرقوں کو کامل آزادی دے رکھی تھی اور خوارج کے سوا، جن کی سیاسی سرگرمیوں سے سلطنت کا امن و امان خطرہ میں تھا۔ عیسائی، یہودی، زردشتی، مجوسی، مانوی اور دوسرے تمام مذاہب کے ساتھ کبھی مذہبی ناروا داری یا سیاسی تشدد سے کام نہیں لیا گیا۔

اس طرح راسخ العقیدہ دینیاتی فکر کی تشکیل تدریجاً عمل میں آئی جس میں سیاسی اثرات کا بھی دخل تھا۔ سب سے زیادہ قوی عنصر جو اسلام کے دینی افکار پر مؤثر ہوا عربوں کا اخلاقی اور مذہبی تفوق تھا۔ یہ تفوق اس وقت بھی قائم رہا، جبکہ اُن کی سیاسی قیادت ختم ہو گئی، کہیں کہیں عربیت کے خلاف صدائیں بھی بلند ہوئیں، مگر مذہبی فکر کے دائرہ میں ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ عربیت کا مرکز اور مستقر مدینہ تھا، جہاں سے اسلام آگے بڑھا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں مسلمانوں کے ابتدائی مذہبی علوم مرتکز تھے۔ قرآن کی ترتیب و تدوین اسی شہر میں ہوئی۔ احادیث کی روایات کا چرچا بھی یہیں سے شروع ہوا، اور مذہبی تحقیقات کے سلسلہ میں

تاریخ اور لسانیات کے استعمال کا آغاز بھی یہیں ہوا۔ ابتدا ہی سے تمام ممالک کے طلبا خواہ پیدائشی مسلمان ہوں یا تبدیل مذہب کے باعث داخلِ اسلام ہوئے ہوں، عرب ہوں یا غیر عرب مدینہ کو علم کا مرجع سمجھتے تھے۔ اور صحابہ کرامؓ تابعین اور تبع تابعین سے صحیح اسلامی عقائد کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مجتمع ہو جاتے تھے۔ دوسرے ممالک کے مکاتیب اور مدارس کی حیثیت مقامی تھی، مگر مدینہ علوم اسلامی کا عالمگیر مرکز تھا۔

مدینہ کے علمی اور مذہبی تقدم کا ایک اور سبب بھی تھا۔ اسلام دین و حکومت کی علیحدگی کو تسلیم نہیں کرتا لیکن ہجرت کے تیس چالیس سال کے بعد ہی وہ مذہبی اور اخلاقی رشتے منقطع ہو گئے، جن سے خلفائے راشدین کی حکومت کا وقار قائم تھا، اس کے بعد جو حکومتیں آئیں، ان کا دار و مدار فوجی قوت پر تھا۔ اس طرح عملاً دین اور حکومت ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ مگر مدینہ نے اس صورت حال کی واقعیت کو تسلیم نہیں کیا۔ اس لئے یہ شہر ان تمام گروہوں کا مرکز بن گیا، جو مذہبی بنیادوں پر حکومت کے مخالف اور دنیا پرست حکمرانوں کی سیاسی قیادت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے، اسلامی سلطنت کے تمام دوسرے صوبوں کے اہل علم اس بارے میں اہل مدینہ کے ہمنوا تھے۔ علاوہ ازیں مدینہ کے علماء اس مسئلہ میں جس مضبوطی اور راست روی سے اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ دینیاتی مسائل میں ان کی قدامت پسندی کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے، ان کی نگاہ میں بھی علمائے مدینہ کا وقار بڑھ گیا۔

اس طرح اہل مدینہ کے مذہب نے دوسرے مقامی مذاہب کو جن میں عراقی مذہب کو خاص اہمیت حاصل ہے ایک یکساں شکل عطا کرنے میں مؤثر طور پر حصہ لیا۔ مزید برآں اہل مدینہ کی عملی ذہنیت اور ان کی متقیانہ روح بھی تمام مقامی دینیاتی مذاہب کے اندر سرایت کر گئی۔ زمانہ مابعد میں اسلام کے دینیاتی عقائد کا ارتقا جن خطوط پر ہوا اس کی داغ بیل مدینہ میں پڑ چکی تھی، اس لئے مقامی مذاہب اپنے امتیازی خصوصیات کے باوصف ان اصولوں سے مطابقت کرنے پر مجبور تھے، جو مدینہ میں وضع کئے جا چکے تھے، اور سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی، کہ دین کو سلطنت کی سیاسی تنظیم میں خلط ملط ہونے سے بچا کر اہل مدینہ نے اس کو سیاسی تغیرات کی سطح سے بالاتر رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے سیاسی تفوق کے زوال کا اسلامی عقائد اور دینیات پر کوئی قابل ذکر اثر نہ ہو سکا۔

عباسی حکومت کے قیام کے ساتھ اہل مدینہ کی کوششوں کے نتائج منظر عام پر آنے لگے۔ مدینہ کی راسخ العقیدگی ارباب حکومت کے سیاسی پروگرام میں داخل ہو گئی۔ چنانچہ عباسی حکمرانوں نے ان کے دینی عقائد کی ہر ممکن طریقہ سے تائید کی بلکہ بعض حکمرانوں نے دو چار قدم آگے بڑھ کر بے دینی کے استیصال پر بھی کمر باندھی اور ایسے اسلامی عقائد کو ملعون و مردود اور قابل سرزنش قرار دیا جو راسخ العقیدہ معیارات پر پورے نہیں اترتے تھے، بالخصوص ناستک اور ثنویت پسند فرقوں کے ساتھ بعض حالات میں تشدد سے کام لیا گیا۔ یہ دونوں فرقے پھر بھی باقی رہے، لیکن اسلامی فرقوں کی حیثیت میں نہیں۔ اسلامی عقائد کے دیگر مکاتیب خیال میں سب سے زیادہ اہم مکتب خیال وہ تھا جو یونانی فلسفہ سے متاثر تھا۔ اس گروہ کی تردید جو

معتزلہ کے نام سے مشہور ہے اتنی آسان نہ تھی۔ اسلئے راسخ العقیدہ دینیاتی نظام اور معتزلہ کی کشمکش تقریباً دو سو سال تک جاری رہی۔

مسئلہ مابہ النزاع مابعد الطبیعیاتی نوعیت کا تھا۔ یونانی فلسفہ کا بنیادی تصور عدل ہے لیکن مشرقی فلسفہ نے اس تصور کو کبھی وہ اہمیت نہیں دی جس کا وہ مستحق ہے۔ معتزلہ جو یونانی افکار سے متاثر تھے۔ اس تصور کو اسلام کے دینیاتی نظام میں کھپانا چاہتے تھے۔ لیکن راسخ العقیدہ اہل مذہب خدا کے مشرقی تصور پر سختی کے ساتھ جمے ہوئے تھے جس کی رو سے خدا لامحدود قوت لامحدود رحمت اور رحمانیت کا حامل ہے۔ معتزلہ کے نزدیک خدا کی سب سے اعلیٰ صفت اس کا لامحدود عدل تھی۔ ان کے مخالفین کا اعتراض یہ تھا، کہ اس تصور سے خدا کی قدرتِ کاملہ کی نفی ہوتی ہے اور عدلِ مطلق کا تقاضا خدا کے اختیارات کی تحدید کرتا ہے حالانکہ یہ تصور فہم انسانی کی پیداوار ہے۔ فلسفہ سے جب یہ مسئلہ دینیات کی سرحد میں داخل ہوا تو اس نے جبر و اختیار کی بحث کی صورت اختیار کی اور یہ بحث ایسی تھی، جس پر فریقین یکساں استدلال کے ساتھ قرآن حکیم سے استشہاد کر سکتے تھے۔

دوسری بات یہ تھی، کہ یونان زدہ مکتب خیال جو فلسفیانہ استدلال میں زیادہ پختہ تھا، راسخ العقیدہ گروہ کے اس تصور کا مخالف تھا کہ خدا کی صفات سمع و بصر کلام اور ارادہ وغیرہ اس کی ذات سے الگ کوئی مستقل وجود رکھتی ہیں، کیونکہ اگر ان صفات کا علیحدہ موجود ہونا تسلیم کر لیا جائے، تو اس سے خدا کی واحدیت کو صدمہ پہنچنا لازمی ہے اس مسئلہ میں بھی ساری بحث ایک نقطہ پر مرتکز ہو گئی یعنی کلام الٰہی کی نوعیت کیا ہے۔ پھر چونکہ قرآن خداوند تعالےٰ کا کلام ہے اس لئے مسئلہ کی شکل یہ ہو گئی کہ آیا قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ معتزلہ کا دعویٰ تھا، کہ قرآن مخلوق ہے اور ان کے مخالفین کو خلقِ قرآن کے عقیدہ سے انکار تھا۔ سب سے عجیب بات اس بحث میں یہ تھی، کہ معتزلہ نادانستہ طور پر یونانی فلسفہ کے اس عقیدہ کو اپنا رہے تھے، جو کلمہ الٰہی (LOGOS) سے متعلق ہے۔

علم کلام کی تاریخ میں معتزلہ کو عموماً معقولیین یا آزاد خیال قرار دیا جاتا ہے لیکن جدید ترین انکشافات سے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے۔ حال حال تک معتزلہ کے بارے میں ہماری معلومات کا ماخذ زیادہ تر وہ کتابیں تھیں، جو اُن کے مخالفین کی تصنیف کردہ ہیں، اور جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا، کہ معتزلہ عام دینیاتی عقائد کے مخالفین کا ایک گروہ تھا۔ اب معتزلہ کی بعض اصلی تصانیف حاصل ہوئی ہیں جن سے ان کے کارنامہ پر ایک نئی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفکرین اور معلمین اسلام کا ایک خاصا اہم گروہ تھا، جس نے مفتوحہ علاقوں میں اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔ جس ماحول میں یہ گروہ پیدا ہوا، اس کی خصوصیت یہ تھی، کہ مدینہ کے سیدھے سادے زاہدانہ انداز کے عقائد یونانی ثقافت کی علمی روایات اور نا ستک فرقوں کے افکار سے دست و گریبان تھے۔ اس طرح مغربی ایشیا کے ان ملکوں میں جہاں فاتحین داخل ہوئے ایک بڑی زبردست خلیج فکر حائل ہو گئی تھی جس کا پاٹنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ اس فکری خلیج کے باعث عراق میں خصوصاً پہلی دوسری صدی ہجری تک عجیب و غریب ملحدانہ عقائد کی گرم بازاری رہی۔ معتزلہ کا کارنامہ یہ تھا، کہ انھوں نے